حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

عہد اور علمی خدمات

۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء ـــ ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء

.... (از ڈاکٹر ماجد علیخاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

اللہ جل شانہ نے اس عالم میں موت وحیات کا رشتہ ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جس سے ادنیٰ واعلیٰ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، چاہے وہ انبیاء جیسے مقرب بارگاہ ہوں یا فرعون، ہامان وشداد جیسے مغضوب وضال ہوں سب کو موت کی آغوش میں بالآخر جانا ہی ہوتا ہے اور اسکے ذائقہ کو چکھنا ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ، (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) باقی رہنے والی ذات صرف خداوند قدوس کی ذات ہے اسکے علاوہ ہر شئی پر ازل ہی سے فنا کے لفظ کو ثبت کر دیا گیا ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

اسکے باوجود کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو اس فانی دنیا میں موت سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ کے یہاں وہ حیات شمار کی جاتی ہیں وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرہ ۱۵۴:۲)۔

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مُردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں

لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی مفہوم میں عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے۔ موت التقی حیات لا نفاد لها!

قد مات قوم وهم فی الناس احیاء

(ترجمہ) متقی اور پرہیزگار کی موت غیر فانی زندگی ہے، یہ لوگ بظاہر مر چکے ہیں حالانکہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ یہی ہیں۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو بظاہر تو اس عالم فانی سے گذر چکے ہیں لیکن ان کے کارنامے اب بھی زندہ و جاوید ہیں اور عالم انسانیت میں یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، آپ کی پیدائش رامپور میں ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء ہوئی اور وفات ۲۷ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۸۷ء بروز جمعرات ہوئی۔

حضرت مولاناؒ کا تعلق پٹھان قوم سے تھا، حسن اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی کہ راقم الحروف کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے، میرے ان دو متضاد الفاظ کے استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم میں بعض خصائص متضاد ہوتے ہیں، جہاں پٹھان اپنی جرأت خودداری دلیری، بہادری، اعلیٰ ظرفی اور بات کی پختگی کے لئے مشہور رہیں اور ان کے اندر یہ صفات ملتی ہیں وہاں اگر اس قوم کا جلاء نہ ہوا ہو اور اصلاح کی منازل تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر یہ غضب اور شہوت میں ڈوب کر انسانی حدود کو پار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتی، جس کی مثال موجودہ دور میں کراچی کے پختون و مہاجر فسادات اور رام پور شہر میں آپسی قتل و غارت ہے اور ماضی میں پٹھان ریاستوں کے حکمرانوں و اُمراء کا ظلم و تشدد اور نادر شاہ کا دہلی میں قتل عام ہے۔ اسی وجہ سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہے، ایک صاحب نے ایک پٹھان سے کہا "میاں پٹھانوں میں کوئی پیغمبر ہی نہیں ہوا"، پٹھان صاحب نے جلّا کر جواب دیا "تم جھوٹ بولتے ہو کیا

(حضرت) عیسیٰ خاں اور (حضرت) موسیٰ خاں کا نام نہیں سنا"۔ دراصل یہ اسلام کی خوبی ہے کہ ان متضاد صفات کی حامل قوم بھی اس کے دامن سے وابستہ ہوکر حضرت سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ اور فیض تامہ سے مستفیض ہوئی

رامپور ایک ایسا شہر ہے جس کی گود میں سینکڑوں صاحب علم شخصیتوں شعراء ادباء، صوفیاء اور علماء نے پرورش پائی اور اسکے آب وگل سے استفادہ کیا، اسی زمین کے بطن سے مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی نکلے ہیں اگر رامپور کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسی اعلیٰ شخصیتیں کم ہی ملیں گی جنھوں نے اس شہر کے دو تاریخی دوروں کو اچھی طرح دیکھا دیر کھا، اور اپنی زندگی کے بڑے حصوں کو دونوں دوروں میں گذارہ ہو۔ ایسے علماء میں اگر حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا نام لیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحب کا شمار نہ صرف ایسے علماء میں کیا جاتا ہے بلکہ ایسے صوفیاء میں بھی جنھوں نے اپنی زندگی کے بڑے حصوں کو رامپور کے دو اہم تاریخی ادوار میں گذارہ ہو۔ میری مراد رامپور کے ایک اس دور سے ہے جو اس کا ریاستی دور تھا اور دوسرے اس دور سے ہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادی ہند کے بعد کا۔ یا پھر یوں کہا جائے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا دور ہے جب کہ ریاست کا خاتمہ ہوا اور رامپور ہندوستان کے نقشہ میں ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

حضرت مولانا کے علمی و دیگر کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شہر کے ان دو دوروں کے متعلق بھی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ لکھ دیا جائے۔

رامپور کا ریاستی دور

رامپور کا ریاستی دور جہاں ایک طرف شاہی دبدبا در پٹھانی شان وشوکت کا دور تھا تو وہاں یہ دور درباری خوشامد و جی حضوری کا بھی دور تھا، ویسے عام طور

پھر رامپور کو ایسے حکمراں ملے جنھوں نے علمار اور مذہبی پیشواؤں کی قدر و منزلت کی، ریاست میں ایک اعلیٰ دینی ادارہ مدرسہ عالیہ بھی قائم کیا گیا جس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی، بڑے بڑے علمار اس کی مسند درس پر بیٹھنا اپنے لئے باعث عزت سمجھتے تھے، مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی طرف سے ہی پورے ہوتے تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں کافی بڑی تعداد میں اہل علم و حرفہ آگئے تھے، یہاں کے نوابین ان کی امداد بڑی فراخدلی سے کرتے تھے، اس ریاست نے ایسے حکمرانوں کو جنم دیا جنھوں نے غالب، داغ، امیر مینائی جیسے شعرار اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اطبار اور اہل علم کی مہمان نوازی کی۔ البتہ یہ دور جاگیردارانہ نظام پر قائم تھا، اگر اس دور میں نوابین کی نظر عنایت سے راتوں رات ایک غریب و بے آسرا شخص جاگیردار زمیندار یا مستاجر بن جاتا تھا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر شہر کے بڑے بڑے اور چنیدہ مستاجروں سے گاؤں کو ضبط کرکے روٹیوں کا محتاج بھی کر دیا جاتا ہے، ایسے حالات میں جب کہ افراد کی ترقی و تنزلی حکمرانوں کی ابروئے چشم کی مرہون منت ہے اصلاحی و علمی اور ٹھوس کام کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی، یہی وجہ تھی کہ بعض وہ علمار و ادبار اور اہل حرفہ جو ان باتوں کو جھیل نہ سکتے تھے، ریاستوں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے تھے۔

رام پور کے ریاستی دور کی بعض اہم خصوصیات بھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے، یہاں پر اس دور میں بے روزگاری عام طور پر نہیں تھی، لوگ نسبتاً خوش حال تھے، نوابین نے رامپور میں بہترین عمارتیں بنواکر اس کو مغربی یوپی کا ایک منفرد شہر بنا دیا تھا، نواب حامد علی خان کا بنوایا ہوا قلعہ اور اس کے اندر کی حامد منزل نیز دوسری عمارات اسلامی تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں، اسی طرح نواب رضا علی خاں صاحب کے دور میں بھی کثیر تعداد میں عمارتیں بنیں، سڑکیں چوڑی ہوئیں، شہر کی خوبصورتی

میں اضافہ ہوا، اس شہر کے باغات لکھنؤ کے باغات کے ہم پلہ تھے، خسرو باغ اور بے نظیر باغ کے درمیانی سڑک جس کو عام طور پر ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، کی مثال دور دور تک ملنا مشکل تھی۔ نواب رضا علی خاں صاحب نے آزادی ہند سے قبل رامپور میں اتنے کارخانے قائم کردا دیئے تھے کہ یہ شہر چھوٹا سا کانپور کہلایا جانے لگا، یہ انکی دور بینی کی اہم مثال ہے اگر وہ تمام کارخانے آج بھی اسی طرح قائم رہتے تو یہ شہر انڈسٹریز میں یوپی کے بہت سے صنعتی شہروں سے آگے ہوتا۔

اگر نواب حامد علی خاں صاحب رامپور کے اکبر تھے تو نواب رضا علی خاں صاحب کو رامپور کا شاہجہاں کہنا بیجا نہ ہوگا، ریاستی دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ رامپور میں فیملی سسٹم پوری طرح محفوظ تھا، گھر اور خاندان کے بڑوں کا چھوٹے ادب واحترام کرتے اور گھریلو و خاندانی روایات کو زندہ رکھتے، علماء کا عام طور پر احترام تھا اور صوفیاء کی توقیر و عزت کی جاتی۔

رامپور کا حال آزادی کے بعد:

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے چند سال بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوا اور اس میں رامپور سر فہرست رہا، اب رامپور ریاست کے بجائے اتر پردیش گورنمنٹ کا ایک ضلع بن گیا جس کا افسر اعلیٰ و منتظم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ضلع کلکٹر ہوگیا۔

ریاست کے خاتمہ پر سب سے برا اثر فوج اور پولیس کے ملازمین پر پڑا، ہزاروں کی تعداد میں ریاست کے دور کے فوجی اور پولیس والے ملازمت سے سبکدوش کردیئے گئے اس کے نتیجے میں بیروزگاری عام ہوگئی جو کسر رہ گئی تھی زمینداری کے خاتمہ نے اس کو بھی پورا کردیا، رامپور کے زمیندار پٹھان کاشتکاری کو عیب سمجھتے تھے، چنانچہ زمینداری جاگیرداری اور مستاجری کے خاتمہ سے بڑے بڑے صاحب حیثیت پٹھان روٹیوں کے محتاج ہوگئے غربت اور افلاس نے ان کے دروازوں پر دستک دینا شروع کردی تعلیمی اعتبار سے بھی

ان لوگوں کے پاس اعلیٰ ڈگریاں نہیں تھیں، لہٰذا ان میں سے بہت سے لوگوں نے معمولی ملازمتوں پر گذر اوقات کرنے پر قناعت کی، اس طرح اس چھوٹی سی ریاست کی خوشحالی پامال کردی گئی، غربت کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہوا۔

رامپور کے پٹھان مزاج کے اعتبار سے بہت گرم واقع ہوئے ہیں، جرائم کے اضافے میں مزاج کی اس گرمی کا بھی اثر کافی ہے اس کے علاوہ آزادی کے غلط تصور نے بھی لاقانونیت میں اضافہ کیا ہے۔ عام لوگ آزادی کو غیر ملکی حکومت سے آزادی کی جگہ آزادیٔ قانون (یعنی قانون سے چھٹی) تصور کرنے لگے ہیں چنانچہ عام طور پر قانون کا احترام دل سے اٹھ گیا ہے، پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی حد تک خود قانون شکن بن بیٹھے ہیں، غرض ان تمام اسباب کی وجہ سے رامپور میں بالخصوص اور اس ملک میں بالعموم آزادی کے بعد لاقانونیت کا دور دورہ ہوا، اس شہر میں آپسی قتل و غارت کی جو فضا اب پیدا ہوگئی ہے یا پیدا کردی گئی ہے اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ہی ملیگی معمولی معمولی بات پر پستول کی گولی یا چاقو کی نوک سینے کے اندر ہوتی ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن میں ایک قتل محض ساڑھے دس آنے (موجودہ تقریباً ۶۵ پیسے) کے لین دین کی تکرار پر ہوا تھا

ریاست کے خاتمہ کے بعد اس شہر سے فیملی سسٹم کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہونا شروع ہوگیا، گھر اور خاندان کے بزرگوں کی عزت و احترام آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہوگیا، البتہ اگر کسی کے خاندان میں کوئی شرابی جواری اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے تو اس کا احترام محض عزت بچانے کے ڈر سے ضرور ہوتا رہا۔ فیملی سسٹم کے خاتمہ کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عام لوگوں نے روزگار کی خاطر باہر کا سفر کرنا شروع کردیا اور پھر تیل کی دولت کی وجہ سے خلیجی ممالک میں ملازمتوں کی بوچھار نے ان خاندان کے ذہنوں میں احساس برتری پیدا کردی جو غربت و افلاس میں گرفتار تھے اور نو دولتیے

کا ایک جدید طبقہ وجود میں آگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت اور احترام کی وجہ مال اور عہدہ بن گیا، رام پور کا مثالی معاشرہ تقریباً تباہ ہو گیا، جو لوگ باہر نہ جاسکے انھوں نے مقامی طور پر غیر قانونی دھندے شروع کر کے دولت بٹورنے کی ریس میں شوق وذوق سے حصہ لینا شروع کر دیا جس کی وجہ سے جوا سٹہ اور شراب بنانے دیجئے جیسے مخرب اخلاق کاروبار غیر قانونی طور پر محلوں میں عام ہو گئے، پولیس کی بھی جیبیں گرم ہوئی اسکا نتیجہ سا ہے کہ عام اخلاقی سطح اور گر گئی۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین صاحب کی کرامت

یہ تھے وہ حالات جن کا سابقہ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خانصاحبؒ کو کرنا پڑا، لیکن ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مولانا نے اپنے دینی علمی اور اصلاحی مشن کو جاری رکھا صوفیاء کے اندر ایک اصطلاح ہے "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" (یعنی دین پر استقامت کرامت کے اوپر فوقیت رکھتی ہے)

حضرت مولانا نے رامپور کے ریاستی دور اور آزادی کے بعد کے دور دونوں دوروں میں جس بے مثال استقامت سے دین کی خدمت کی ہے وہ یقیناً حضرت مولانا کی ایک اہم کرامت ہے ان کی اس بے لوث خدمت کی وجہ سے دونوں دوروں میں ان کی عزت اس شہر کے اشراف و اشرار میں سے ہر فرد کے دل میں یکساں طور پر رہی، یہاں تک کہ علم و تقویٰ میں ان کا نام رامپور میں ضرب المثل بن گیا، گھروں اور خاندانوں میں ان کے نام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں نے علی گڈھ میں دینیات کی تعلیمات شروع کیں تو والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ علی گڈھ میں دینیات پڑھ کر تم مولوی وجیہہ الدین صاحب تو بن نہیں جاؤ گے، اگر کوئی شخص بہت زیادہ عبادت اور نماز روزہ کی طرف راغب ہوتا تو لوگ کہتے کہ وہ تو مولوی وجیہہ الدین صاحب بننے کی فکر میں ہے، واعظین اور خطیب

حضرات حضرت مولانا کے طرز پر وعظ و خطبہ کہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھنے لگے، غرض حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے دونوں دوروں میں اپنی علمیت اور تقویٰ کا سکہ رامپور کے عوام کے دلوں پر بٹھا دیا اور اپنے وعظوں، علمی مجالس، جمعہ کے خطبوں اور درس و تدریس کے ذریعہ دونوں دوروں میں اس شہر کے مسلمانوں کی نیز ملک کے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کی اصلاح فرماتے رہے۔

شہر کے بڑے و چھوٹے، ہندو و مسلمان، امیر و غریب، حکمراں و رعایا، زمیندار و کاشتکار، سرمایہ دار اور مزدور سب کے سب مولانا کی یکساں طور پر عزت کرتے اور ان کی شخصیت کو رامپور کے لئے باعث فخر جانتے، میری کوتاہ نظر میں اس شہر کی مختصر تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت بحیثیت عالم دین نہیں ابھری جس نے عوام و خواص دونوں کو اس طرح گرویدہ بنا لیا ہو جس طرح کہ حضرت مولانا کے لوگ گرویدہ تھے۔

رامپور کے اس دور میں جو کہ آزادی ہند کے بعد شروع ہوا مولانا نے جس طرح رامپور کے عوام و خواص کی دینی و اخلاقی رہنمائی کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے، آپ نے اپنے مواعظ اور خطبات کے ذریعہ عوام کو احساس کمتری سے نکالا ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور برائیوں سے دور کرنے کوشش کی، جیسا کہ میں نے تحریر کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں فیملی سسٹم تک اثر انداز ہوا ہے، عام طور پر بڑوں کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے اس پرفتن دور میں جبکہ الیکشنوں میں مخالف امیدوار کی سات پیڑھیوں تک کے حالات اگل دیئے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کی ٹوپیاں اچھالنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے مولانا نے اپنے بے مثال عمل و کردار کے ذریعہ اہل رامپور کے دلوں کو جیت لیا۔

اخلاق:۔ جو لوگ حضرت مولانا سے ملتے رہے ہیں ان کو معلوم ہے کہ

مولانا رحمہ کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی جس کا ان لوگوں کو اندازہ لگانا مشکل ہے جو مولانا کے قریب نہیں آئے تھے۔ اپنے ہم عمر لوگوں کی عزت اور چھوٹوں سے محبت حضرت مولانا کی مجلس کا ایک عام دستور تھا اس کی وجہ سے رامپور کے عوام مولانا کے گرویدہ بن گئے تھے چھوٹوں سے محبت کے ایک دو ذاتی واقعات ان سطور میں تحریر کرتا ہوں۔

اپنی کسی ضرورت سے حضرت مولانا دہلی تشریف لائے۔ جمعہ کی نماز میں جامعہ ملیہ کی مسجد میں حضرت مولانا کو دیکھ کر راقم السطور بہت خوش ہوا اور بعد نماز غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت مولانا نے بہت خندہ پیشانی سے درخواست کو شرف قبولیت بخشا، وہاں پر جامعہ کے کئی دوسرے حضرات بھی جمع ہو گئے، حضرت مولانا نے ان سے کہا: ڈاکٹر صاحب میرے محلہ دار بھی ہیں (یہ بات میرے لئے نئی تھی) پھر خود ہی اپنے مخصوص انداز میں تشریح کی اور فرمایا: ان کے دادا اور میرے والد پڑوسی تھے اور بچپن میں میں بھی ان کے دادا کے مکان کے قریب محلہ کٹرہ جلال الدین خاں کے اس حصہ میں رہتا تھا جو کہ اب قلعہ میں آچکا ہے، ہم لوگ صبح کو فجر کے بعد ٹہلنے نکل جاتے تھے۔ جب واپس آتے تو اکثر ان کے دادا مکان کے باہری حصے میں بیٹھے ہوئے ملتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے: بچوں چائے پیو گے، ہم لوگ ان کی چائے کو اس وجہ سے پسند کرتے تھے کہ وہ خالص دودھ میں پتی اور قند ڈال کر چائے بنواتے تھے اور ہمیں پلاتے تھے۔

رامپور میں جب قلعہ کی تعمیر ہوئی تو حضرت مولانا رحمہ محلہ کٹرہ سے محلہ انگوری باغ منتقل ہو گئے اور ہمارا خاندان بذریا ملا ظریف لیکن وہاں بھی مولانا سے اس طرح نسبت رہی کہ محلہ بذریا ملا ظریف حضرت مولانا رحمہ کے خاندان کے ہی ایک صاحب ملا ظریف خاں صاحب کے نام پر آباد تھا[1]

---

[1] مولانا سردار خاں، حالات مشائخ ص ۲۲۶ : وجیہہ الدین احمد خاں صاحب فیوض نادرہ ذیریہ ص ۵۰

چھوٹوں پر شفقت کے سلسلہ میں ایک دوسرا ذاتی واقعہ بھی نقل کرتا ہوں۔
راقم السطور کی ایک بھتیجی کا نکاح حضرت مولانا رح نے ہی پڑھایا تھا راقم السطور اس
کا وکیل کی حیثیت سے آیا، تو مولانا نے ازراہ شفقت فرمایا: آپ ہی نکاح پڑھا دیں
(نوٹ: عوام کی معلومات کیلئے عرض ہے کہ ولی کی طرح وکیل بھی خود نکاح پڑھا
سکتا ہے) لیکن احقر نے بہت ہی ادب سے درخواست کی کہ مولانا نکاح تو آپ ہی
پڑھائیں گے۔ اسکے بعد برصغیر ہند و پاک کی ایک جماعت کے سربراہ جو کہ اس وقت
حیات تھے ان کی ایک تحریر کے بارے میں مولانا رح فرمانے لگے دیکھئے انھوں نے
یہ لکھا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، یہ میں اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ حضرت
مولانا جب کبھی بھی ان حضرات کے مسلک یا رائے کا ذکر کرتے جن کا مسلک یا رائے
حضرت مولانا سے مختلف ہوتا تو ان لوگوں کے نام کو بہت مناسب الفاظ میں لیتے لیکن
ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی پرزور الفاظ میں ذکر کر دیتے۔ میں نے مولانا کی زبان
سے اپنے مخالفین کے لئے بھی سخت الفاظ نہیں سُنے۔

حضرت مولانا رح کے اخلاق کے سلسلے میں ایک اور ذاتی واقعہ تحریر ہے۔ گو کہ یہ
واقعات پرائیویٹ ہیں لیکن ان سے مولانا کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے اس
وجہ سے ان کو نقل کر رہا ہوں۔ راقم السطور ویسٹ انڈیز ملازمت کے دوران ایک
مرتبہ ویسٹ انڈیز سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا، بعد مغرب حضرت مولانا سے ملنے کی غرض
سے مدرسہ فرقانیہ حاضر ہوا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت حلقۂ ذکر ہوتا ہوگا،
معمول کے مطابق اس وقت حلقہ ذکر ہو رہا تھا اور اس جگہ بہت ہی ہلکی روشنی تھی
یا اندھیرا تھا جس میں ایک دوسرے کو دیکھا نہ جا سکتا تھا میں ایک کونہ میں بیٹھ گیا لیکن
حضرت مولانا رح کو آہٹ محسوس ہوئی۔ فوراً دریافت کیا کون؟ میں نے عرض کیا: ماجد۔
فرمایا، کیا امجد خاں صاحب کے لڑکے، میں نے کہا: جی ہاں، یہ سنتے ہی حلقۂ ذکر

بند کروا دیا گیا، تیز روشنی کروائی اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد ذاتی واقعات ہیں جن کو طول کی وجہ سے ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

جب حضرت مولانا کے یہ اخلاق اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معاملات واخلاق کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، اس ماحول میں ان اخلاق کا حامل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت کے لئے منتخب کیا ہو۔

راست گوئی وبیباکی:

مومن کی ایک پہچان اس کی راست گوئی اور صاف گوئی ہے جبکہ منافق کی ایک پہچان اس کی کذب بیانی ہے، حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب رح اپنی راست گوئی اور صاف گوئی کے لئے مشہور تھے۔

آپ کی راست گوئی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے، حضرت مولانا شکار کے بہت شوقین تھے ایک مرتبہ شکار کو تشریف لے گئے، ساتھ میں اور صاحبان بھی تھے، شیر کا شکار تھا، حضرت مولانا وقت پر شیر کی تاک میں بیٹھ گئے، اتفاق سے شکاریوں میں سے (یعنی ساتھیوں میں سے) ایک صاحب ایک جھاڑی میں کسی ضرورت سے گئے ہوئے تھے جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے حضرت مولانا سمجھے کہ جھاڑی میں شیر ہے چنانچہ بندوق داغ دی، گولی اس شخص کے لگ گئی اور وہ بعد میں انتقال کر گیا، یہ شکار نینی تال کے ترائی کے علاقہ میں کھیلنے گئے تھے، حضرت مولانا پر قتل کا مقدمہ قائم ہوگیا، بیان کے لئے جب پیشی ہوئی تو آپ نے صاف صاف فرمادیا کہ ہاں میری بندوق سے گولی ان کے لگی تھی البتہ میں نے ان کو مارنے کے ارادہ سے بندوق نہیں چلائی تھی بلکہ شکار کے ارادہ سے چلائی تھی، عدالت نے حضرت مولانا رح کو اس راست گوئی پر بری کردیا، بعد میں حضرت مولانا نے ان صاحب کے خاندان کے لوگوں کو خوں بہا کے طور پر کھیتی کی زمینیں دیں۔

حضرت مولانا کی بیباکی کے سلسلہ میں "حالات مشائخ" میں تحریر کردہ ایک واقعہ قابل توجہ ہے جس کو یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی رامپور کے قلعہ کے میدان میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں شرکار کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار بیان کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم اجتماع غالباً رامپور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہوگا، اس جلسہ میں ریاست کے سابق نواب رضا علی خاں اور سابق چیف منسٹر رامپور بشیر حسین زیدی بھی شریک جلسہ تھے اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک کی ہندو اکثریت کے ساتھ حکومت وقت بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی، کیونکہ ہندوستان، پاکستان کے مسلمانوں کا جو آپس میں تعلق ہے وہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ خون اور رشتے کا بھی ہے، اگر کسی کا باپ وہاں ہے تو کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی تو کسی کی بہن (وغیرہ)

اب اگر ان حالات میں یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہم اسکے دشمن ہیں تو یہ بات بھی غلط اور واقعہ کے خلاف اور منافقت بھی، اور پھر کوئی دل سے ماننے کو آمادہ بھی نہیں، اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے بہت گہرا تعلق ہے ہم اسکے دوست و ہمدرد ہیں تو ہم ملک کے باغی اور غدار قرار پائیں، ایسے نازک اور سنگین موقعہ پر آپ نے جو تقریر فرمائی بس وہ آپ ہی جیسے اولوالعزم حضرات کا کام ہے مسلمانوں کی زبان سے تو بے ساختہ کلمات تحسین ادا ہو رہے تھے اور غیر مسلم بھی آپ کی حق گوئی اور قابلیت کے گن گا رہے تھے، آپ نے نہایت حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ہم نہ باغی ہیں اور نہ غدار اور نہ منافق، اسلام منافقت کو پسند نہیں کرتا، وطن سے محبت کی اگر اہمیت ہے تو مسلمانوں کی اسلام اور

اہلِ اسلام سے بھی محبت بہت اہمیت رکھتی ہے، پاکستان کے رہنے والے مسلمان ہوں یا ترکی کے، انڈونیشیا کے ہوں یا ملیشیا کے، مراکش کے ہوں یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں یا مصر کے، شام کے ہوں یا الجزائر کے، تیونس کے ہوں یا اردن کے، ہم بحمد اللہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف خون اور رشتہ کا یا نام کا نہیں بلکہ اسلامی ہے، سچا مسلمان کبھی منافقت کو پسند نہیں کرتا، ہم اسلام کے پیروکار ہیں اور اس کے حامی و مددگار، اسلام حقانیت کا علمبردار ہے، اگر وطن سے محبت اسلام اور اسلامیت میں خلل انداز نہ ہو تو اسلام ـــ وطن سے ایسی محبت کی مخالفت بھی نہیں کرتا ہے، ہندوستان و پاکستان ایشیا کے ممالک میں سے دو ملک ہیں پہلے یہ دونوں ایک تھے، جغرافیائی حیثیت سے اب یہ دو الگ الگ ملک ہیں، ان دونوں ملکوں کے سربراہوں کو چاہئیے کہ لڑائی کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے اپنے متنازعہ مسائل خود حل کریں، یورپ، روس اور امریکہ کے دست نگر اور محتاج نہ بنیں۔ قرآن عظیم میں ہے کہ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ، صلح بہتر چیز ہے ۔ [1]

حضرت مولانا کی یہ بیباکانہ تقریر آج بھی اسی طرح مفید ہے جس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں تھی۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۴۳، ۲۴۴

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد (قسط ۲)

مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحب رامپوری

عہد اور علمی خدمات

۱۳۱۷ھ م ۱۸۹۹ء ——— ۱۴۰۷ھ م ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

علمی مقام

مولانا ایک بلند پایہ محدث، مفسر اور فقیہ تھے، علم حدیث میں آپ نہ صرف ایک بڑے محدث، اور علامۃ العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے بلکہ خود بھی اونچے درجہ کے محدث تھے آپ نے شوال ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۲ رجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں حدیث شریف کی تعلیم حاصل کرکے سند فراغت حاصل کی[1] یہ سند بہت مشہور ہے۔ رامپور میں بھی آپ نے کتب حدیث کی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی تھی چنانچہ آپ کو حضرت حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ اور ان کے شیخ حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خانصاحبؒ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے[2]۔ حضرت مولانا اپنے تلامذہ کو حضرت مولانا شاہ حافظ وزیر احمد صاحبؒ محدث رامپوری کے توسط سے مندرجہ ذیل سند بھی رحمت فرماتے تھے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ = عن حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ، عن حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری

---

[1] مولانا سردار شاہ خانصاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ رامپور ص ۲۳۰ ۔ [2] ایضاً ص ۲۲۴

عن حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا شاہ سید عالم صاحب نگینوی محدث مرادآبادیؒ عن حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ عن حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ عن سراج المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ سے یہ سلسلۂ حدیث سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب نے طویل عرصہ تک مختلف مدارس میں درس حدیث دیا۔ ایک مرتبہ راقم السطور سے خود فرمایا کہ میں نے ساٹھ سال سے زیادہ درس حدیث دیا ہے۔ یہ مدت قمری (ہجری) سنہ کے اعتبار سے فرمائی تھی۔ "کتاب حالات مشائخ" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ریاست دادوں ضلع علی گڑھ کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ سے ہی مسلم شریف پڑھانا شروع کردی تھی[۶]۔ یہ ملازمت غالباً سنہ ۱۳۴۲ھ سے شروع کی تھی اس طرح ساٹھ سال کی مدت ۱۴۰۲ھ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ حضرت مولاناؒ نے مجھ سے مندرجہ بالا مدت ۱۴۰۲ھ کے بعد ہی کسی تاریخ میں بتائی ہے۔ مولانا کا درس بخاری ایک خاص انداز کا ہوتا تھا جسمیں آپ اکابر محدث کے طرز پر احادیث کی شرح کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر حنفی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے جاتے تھے۔ راقم السطور کو اتفاقاً کئی بار مدرسہ فرقانیہ میں مولانا کے درس بخاری میں شرکت کرنیکی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

اصول حدیث پر ایک کتاب "حدیثی اصول" مولانا کی اس فن میں گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اردو میں اصول حدیث پر یہ کتاب ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے جس میں جگہ جگہ مولانا نے اصول حدیث کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات سے بھی بحث کی ہے۔ مثلاً حدیث مرسل کے مقبول و نا قابل قبول ہونے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں

---

[۵] ایضاً، ص ۲۳۰ [۶] ایضاً، ص ۲۳۵۔

"اگر مرسل کی عادت ثقات اور غیر ثقات کل کے حذف کرنیکی ہے تو باتفاق ائمہ مجتہدین قابل قبول نہیں، اور اگر محض ثقات راوی کو حذف کرتا ہے، تب بھی جمہور محدثین توقف کے قائل ہیں۔ اسلئے احتمال ہے کہ شاید محذوف راوی ضعیف ہو۔ اور یہی امام احمدؒ کا ایک قول ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "کہ اگر حدیث مرسل کی تائید کسی دوسری حدیث سے ہوجائے خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو تو مرسل مانی جائیگی، ورنہ توقف کیاجائیگا" لیکن امام احمدؒ کا قول ثانی اور امام مالکؒ اور امام اعظمؒ بلکہ جملہ کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ بغیر کسی تائید کے بھی مرسل قابل قبول ہے۔ یہی مذہب اشبہ بالحق ہے چونکہ جمہور کا یہ احتمال کہ ممکن ہے محذوف راوی ضعیف ہو، اسوقت قابل اعتماد ہوسکتا ہے کہ ہم ثقہ راوی کی مرسل میں قیدیں لگاتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ثقہ وہی ہوگا جو غیر ثقہ کو نہ چھپائے۔ مرسل کی ثقاہت خود محذوف کی ثقاہت کی دلیل ہے"۔[1]

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"........ یہ تفصیل تعارض سے متعلق مذہب شافعیؒ کی بنا پر تھی۔ اب ہم حنفیہ کے مطابق تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے کہ اول نسخ ہے پھر ترجیح پھر توفیق پھر توقف۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حنفیہ نے توفیق کو مذہب شافعی کے مطابق کیوں مقدم نہیں کیا، اسلئے توفیق کی صورت میں دونوں حدیثوں پر عمل ہوجائیگا، اور نسخ کی صورت میں صرف ایک پر۔

حضرت استاذی مولانا شاہ محمد انور صاحب مدظلہ العالی نے

---

[1] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰، ۳۱۔

اس طرح جواب دیا ہے کہ: "ہمارے امام کا قول حق ہے، اس لئے کہ نسخ سے مراد وہ نسخ ہے جو بطریقۂ نقل ثابت ہوا اور جہاں ہم کو نقل مجبور کرتی ہے کہ ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ، پھر بھی توفیق کی طرف رجوع کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ درحقیقت اسلام یہودیت اور نصرانیت کا ناسخ ہے پھر بھی ہم توفیق کے طالب بن کر فروعات میں اتحاد تلاش کریں۔" ۸ھ

اصح الاسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بعض اسانید کے متعلق اصح الاسانید ہونے کا قول کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ سند۔ "زہری عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ" کو اصح الاسانید کہتے ہیں علی المدینیؒ سند۔ "محمد بن سیرین عن عبیدۃ بن عمر عن علی" کو اصح کہتے ہیں یحییٰ بن معین اور امام النسائیؒ سند۔ "ابراہیم النخعی عن علقمہ عن ابن مسعود" کو اصح کہتے ہیں بخاریؒ سند۔ "مالک عن نافع عن ابن عمر" کو اصح کہتے ہیں۔ ابوبکر بن شیبہ سند۔ "زہری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن علی" کو اصح کہتے ہیں۔

لیکن قول مختار یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلقاً اصحیت کا اطلاق کرنا اور جملہ اسانید کو ہر طرح اسکو کم کر دینا مناسب نہیں۔ اور یہ جس کی تفصیل ائمہ کرام مذکورین سے بعض اسانید کی اصحیت کے متعلق نقل کر چکے ہیں، بعض امورات کو مدنظر رکھ کر اصحیت جزئیہ کا حکم لگایا گیا ہے۔ ہاں جسکی اصحیت کے متعلق ائمہ سے صراحت آچکی ہے وہ ضرور .... ان طرق سے اعلیٰ ہیں جن پر کسی نے آج تک اصحیت کی بالخصوص تصریح نہیں کی ...." ۹ھ

۸ھ ایضاً، ص ۵۲۔ ۹ھ ایضاً، ص ۷۹، ۸۰۔

اس طرح اس کتاب میں مولاناؒ نے بڑی خوبی سے اصول حدیث میں اختلاف ائمہ کو بھی جمع کردیا ہے، یہ کتاب غالباً ۱۳۴۴ھ میں لکھی گئی تھی کیونکہ مولانا محبوب علی صاحب (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ، رامپور) کے مطابق یہ کتاب تصنیف کرنے کے تقریباً ۵۸ سال بعد[10] پہلی بار ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی، کتاب کا یہی ایڈیشن اس وقت ہمارے پاس ہے۔

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے بلکہ ایک مفسر بھی تھے اپنے مواعظ و تقاریر میں قرآنی آیات کی ایسی چبھتی ہوئی تفسیر فرماتے تھے جس سے آپ کی جلالت علم کا اندازہ ہوسکتا تھا، جس زمانے میں آپ کا ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام تھا اور وہاں پر مدرسہ حافظیہ سعیدیہ میں مسند نشین درس تھے تو اس زمانہ میں رئیس اعظم دادوں نواب ابوبکر خان صاحب نے ایک روز آپ سے آیت کریمہ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کی تشریح کرنے کی درخواست کی آپ نے اس پر کافی دیر تک تقریر فرمائی، دوسرے روز نواب صاحب موصوف نے پھر یہی آیت کریمہ پیش کی، آپ نے پھر اس موضوع پر بڑی طولانی تقریر کی، تیسرے روز پھر نواب صاحب نے اسی آیت کریمہ کو تقریر کا موضوع قرار دیا آپ نے تیسرے روز ایسی جامع اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب کا قلب مطمئن ہوگیا[11]

اصول تفسیر کے موضوع پر مولانا کی ایک تصنیف "مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول" کے نام سے ہے، اس میں مولانا نے فہم قرآن، تفسیر قرآن کے طریقے، اسرائیلیات اور قرآن، ترتیب سور اور سائنس اور قرآن جیسے مضامین سے بحث کی ہے فہم قرآن کے سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں

---

[10] ملاحظہ ہو، تعارف، کتاب ہذا، ص ۲ - [11] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر اصول رامپور، ص ۲۷ -

"قرآن عظیم کو چند مقامات پر "کتابٌ مّبین" یعنی کھلی ہوئی کتاب کہا گیا ہے اس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ " قرآن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے :۔ اس غلط فہمی سے بہت سے نتائج بد پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس کے مراتب ہیں جو شخص علوم عربیہ اور لسان عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لئے مجبوراً یہ کہنا پڑیگا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے اسکے لئے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے اور جو اس سے واقف نہیں ہے اس کیلئے کھلی ہوئی کتاب نہیں، اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخ اسلامی اسکے پیش نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتدا ہے یا انتہا۔ یا درمیان اسکے لئے ناممکن ہے[۲۱]"

مفسر کے لئے عربی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بنا پر کسی سورۃ کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اسکے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اس کی ذاتی رائے؟ بعض مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آیات

---

[۲۱] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر کی اصول، رامپور: ص ۲۷

فرقانیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں ایسے مقامات پر اقوال صحابہؓ اور اعمال صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بعض مقامات پر صحابہؓ علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لئے قوت اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا. بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا اس لئے اہم ضرورت ہے کہ مفسر اصول تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلد ہو ۔۔۔۔۔۔۔" [۱۳]

اسرائیلیات اور قرآن کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہوگئے اور ان کی بات قابل پذیرائی ہوگئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے — ان امور کے پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اہل اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن وحدیث اور مسلّمہ کلیات واصول پر نظر کی جائے اور اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینا ضروری ہے۔" [۱۴]

مولانا دیگر مستند اور جید مفسرین کی طرح اسرائیلیات میں سے ہر قسم کی روایات نقل کرنے کے مخالف تھے البتہ وہ قابل اعتبار روایات جو کہ کسی قرآنی واقعہ کی تاریخی تشریح کرتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے اصول کے منافی نہ ہوں قبول کر لینے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحریر کرتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الغرض اسرائیلیات سے مفر بھی نہیں اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں، اس امتیاز کے لئے استعداد علمی اور فراہمی معلومات

---

[۱۳] ایضاً ص ۴۸ [۱۴] ایضاً ص ۵۰۔

دینیہ کے بے حد ضرورت ہے"۔ [شلہ]

سائنس اور قرآن کے موضوع پر مولانا نے اپنی کتاب میں اچھی بحث کی ہے فلسفیانہ خیالات اور سائنسی تحقیقات کو اسی حد تک گوارہ کیا جاسکتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے تحت ہوں چونکہ انسانی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں اسلئے اگر کوئی تحقیق شریعت سے متضاد ہوگی وہ اسلام میں قابل قبول نہیں ہوگی، اس ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔

"دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے۔ طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کرسکے اور پورا علم نہ ہوسکے وہاں خاموشی اختیار کرکے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے" حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے

من العلم ان تقول لما لاتعلم "اللہ اعلم"	یہ علم کی بات ہے کہ جو نہ جانتا ہو اسکے متعلق یہ کہدے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابر اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لاادری" (میں نہیں جانتا) حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسئلے دریافت کئے گئے، چار کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے، کیا ایسے حالات میں اس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلہ کے لئے تیار ہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لئے انکار کردے کہ ماحول اور وقت اسکے خلاف ہے ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

شلہ ایضاً ص ۵۲

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام تو سنی سنائی باتوں کے لئے ہوتے ہیں، پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، مسلمان کو غور کرنا چاہیئے کہ فلسفہ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت، موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد" مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں،

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن[۱۷]

مولانا وجیہ الدین احمد خان صاحب اور تصوف

حضرت مولانا سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک صاحب نسبت شیخ تھے ویسے تو مولاناؒ کو توسل حضرت مجدد الف ثانی سلاسل اربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ قادریہ اور نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی لیکن آپ ذکر و اشغال میں مجددیہ ادریہ سلسلہ پر عمل پیرا تھے، اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی تک حضرت مولاناؒ کا شجرہ اس طرح ہے ـــــ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خان صاحب از شاہ ممتاز حسینؒ از مولانا شاہ وزیر محمد خان صاحبؒ، از شاہ خواجہ محمد خان صاحبؒ از شاہ احمد علی خان صاحبؒ از شاہ سلطان امام الدین خان صاحبؒ، از شاہ درگاہی محبوب النبیؒ از حافظ شاہ سید جمال اللہ صاحبؒ از شاہ قطب الدین سید محمد اشرف حیدر حسینؒ، از خواجہ محمد زبیر مجددی سرہندیؒ، از خواجہ محمد نقشبندی مجددی سرہندیؒ، از خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندیؒ، از امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد

---

[۱۷] ایضاً ص ۵۷

فاروقی سرہندیؒ ۱۶ ۔ (نوٹ : حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر اس سلسلہ و دیگر سلاسل کے شجرے معروف ہیں وہ کسی بھی ایسی کتاب سے دیکھے جاسکتے ہیں جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلاسل کی تفصیل ہو۔ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے بھی اپنی تصنیف "فیوضات وزیریہ" میں یہ تفاصیل لکھی ہیں ملاحظہ ہو ص ۹ ۲۷ تا ص ۳۰۴)

تصوف کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک کتاب "فیوضات وزیریہ" ہے اس میں آپ نے تصوف کی اصطلاحات و دیگر امور بہت سہل انداز میں سمجھائے ہیں، بیعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

"ایک بیعت "علی الاسلام" ہے، غیر مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں پر یا کسی اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔

دوسری "بیعت علی الہجرت" ہے جو انصار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کی تھی، کہ ہم اپنے شہر مدینہ میں آپ کو لے جاکر آرام سے رکھیں گے اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طریقہ سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے اور جو مہاجرین جائیں گے ان کی جانی و مالی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے

تیسری "بیعت علی الجہاد" ہے مختلف مواقع پر جب غزوات اور جہاد کی ضرورت پیش آتی تھی تو حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لیا کرتے تھے کہ ہم مرجائیں گے مگر راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

چوتھی "بیعت علی الخلافت" ہے جو حضور سید الاولین والآخرین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ

تعالیٰ عنہم یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مبارک ہاتھوں پر بیعتیں کی گئیں اور اسی طرح دوسرے حق پرست خلفاء کے ہاتھوں پر بھی بیعتیں ہوتی رہیں۔

پانچویں "بیعت علی الخیر" ہے مسلم شریف میں حدیث مبارک ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے فرمایا، نہ جہاد تھا، نہ ہجرت تھی، نہ اسلام میں داخلی تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی اور ارشاد فرمایا "کہو ہم خیر کے کام کریں گے"

مشائخ کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ یہی "بیعت علی الخیر" ہے بیعت ایک معاہدہ ہے بندہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ....

حضرات صوفیہ "بیعت علی الخیر" لے کر اپنے متوسلین کو انھیں اوراد و وظائف کی تلقین فرماتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تلقین فرمائے تھے ...."[۱۲]

اپنی اس کتاب میں حضرت مولانا نے گاہ بگاہ متقدمین مشائخ کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے، سلوک اور اسکی اہمیت نیز سیر و سلوک کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی تحریر بطور تائید پیش کی ہے:

"......... اور سیر آفاقی کے تمام ہونے کے بعد سیر انفسی میں جس سے مراد سفر در وطن ہے آرام دیتے ہیں۔

هَنِيئًا لِأَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا

---

[۱۲] مولانا وجیہ الدین احمد خاں، فیوضات وزیریہ، رامپور، ص ۹۹ - ۱۰۰ - ۱۰۱ -

اس دولت عظمیٰ تک پہنچنا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کردیں اور اوامر کے بجالانے اور نواہی کے رک جانے سے آراستہ نہ ہو جائیں اس دولت کی بو جان و دماغ میں نہیں پہنچتی باوجود شریعت کی مخالفت کے اگرچہ بال برابر ہی ہو، اگر بالفرض احوال ومواجید حاصل ہو جائیں وہ سب استدراج میں داخل ہیں، آخر اس کو رسوا و خوار کریں گے۔

محبوب رب العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔" (مکتوب ۷۸ دفتر اول حصہ اول)[۱۱]

مولاناؒ نے تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے جس سے ایک عام فہم مسلمان بھی استفادہ کرسکتا ہے، لطائف کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" لطائف خمسہ کی اصلاح کیلئے حضرات نقشبندیہ تدریجی طور پر ہر ایک لطیفہ کا ذکر اور اس کی اصلاح کراتے ہیں۔

غوث زماں قطب عالم مروج شریعت مصطفےٰ قیم طریقہ مجتبیٰ سلطان الاولیاء قطب الارشاد حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہ الاقدس کے یہاں لطیفۂ قلب کی اصلاح کے ساتھ باقی تمام لطائف کی اصلاح ہو جاتی ہے یعنی لطیفۂ قلب کی اصلاح سے پانچوں لطائف کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہی حدیث شریف کے مطابق ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

---

[۱۱] مولانا وجیہ الدین احمد خاں۔ ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹-

"إنَّ فِي الجسد لمضغةً اذا اصلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب" فرمان گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہوجائے تو پورا جسم درست ہوجائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے۔ آگاہ ہوجاؤ وہ دل ہے" ..... [19]

موضوع سماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کسی شخص کا اشعار کا سننا جس سے ذوق وشوق میں اضافہ ہو سماع کہلاتا ہے، اشعار پڑھنے کے طریقے کبھی متعدد ہوتے ہیں، اور کبھی ایک، کبھی یہ پڑھنے والے مزامیر کا استعمال کرتے ہیں اور کبھی بلا مزامیر —— عام طور پر متعدد افراد مع مزامیر یہ کام کرتے ہیں (اور) اسی کو سماع اور قوالی کہتے ہیں۔ ایک شخص اچھی آواز اور اچھے ترنم سے اشعار پڑھے اور وہ پوری طرح باشرع ہو، اشعار بھی لغو اور بیہودہ نہ ہوں نیز اس کے ساتھ مزامیر بھی نہ ہوں تو اس میں کسی کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار مسجد میں پڑھوائے ہیں، بلکہ ان کے لئے منبر بھی بچھوایا ہے، خود بھی حضورؐ نے سنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی سنوائے ہیں، حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ثنائے باری تعالیٰ نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تعریف اسلام اور مدح قرآن ہوتی تھی ....

ہاں ایک یا چند افراد مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھیں تو جمہور علمائے کرام رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ممنوع ہے .... حنفیہ کا مذہب ہے کہ وہ جمہور احناف رحمہ اللہ کا قول دیکھیں، جمہور احناف رحمہم اللہ نے مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۱۲۳

حضرات صوفیہ کرام میں بھی اختلاف ہے حضرات چشتیہ اسکے جواز کی طرف عموماً رجحان رکھتے ہیں، لیکن جواز کیلئے جو شرائط مشائخ چشت کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ اس زمانے میں عموماً مفقود ہیں ——— اس لئے تصوف اور چشتیت کی آڑ لیکر قوالی کے نام کے ساتھ گانا سننا مزامیر کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔[۲]

"وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" تصوف کے دقیق ترین مسائل میں سے ہیں عوام تو عوام بعض علمار کی بھی رسائی ان تک نہیں ہو پاتی، اس لئے اکابر صوفیار کا مسلک یہ ہے کہ ان مسائل کی تفصیلات میں عقل نہیں لڑائی جائے بلکہ سالک اگر کسی واصل باللہ شیخ کی رہنمائی میں سلوک طے کر رہا ہے تو اس حال پر پہنچنے پر اس کو خود بخود اس کی حقیقت کھل جائے گی، حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحبؒ بھی اسی مسلک پر تھے چنانچہ "وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" پر مختصراً تعارفی سطور تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"ہم لوگ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مبارک سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تحقیق اس مسئلہ میں یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں تباین ہے، بندہ خدارسیدہ ہوسکتا ہے، حقیقۃً خدا نہیں ہوسکتا اور یہی قول جمہور حضرات علمار کرام کا بھی ہے، عام طور پر حضرات علمار کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ بندہ نہ ذات خداوند قدوس کے ساتھ متحد ہے، اور نہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے بلکہ اس کی حقیقت اور وجود اللہ تعالیٰ کے قریب ہوجاتے ہیں اس لئے ہمارے حضرات مرشدین طریقہ عالیہ رحمۃ اللہ علیہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب کسی پر حال طاری ہوگا تو وہ خود سمجھ لیگا اور حال طاری نہ ہو تو بندہ کو ہمیشہ

---

[۲] ایضاً ص ۱۳۰ تا ۱۳۲

یہی اقرار کرنا چاہیئے کہ میں بندہ عاجز ہوں اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق، میں جاہل ہوں اور اللہ تعالیٰ عَالِمُ الغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ، میں فانی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا، میری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، اللہ تعالیٰ کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور ابدی۔ کسی چیز میں کسی وقت بھی کسی کا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں اور ہم بندگان قدم قدم پر ہر وقت اور ہر چیز میں اسکے محتاج ہیں۔

اور جو شخص عاجزی اور انکساری اختیار کریگا اور تواضع سے کام لیگا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہٗ اسے عروج اور بلندیاں مرحمت فرمائیگا، دنیا کی بلندیاں کسی شکل میں بھی ہوں پانی کی ہوئے کی طرح ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں —— لہٰذا اہل سلسلہ اس مسئلہ میں جوکہ انتہائی دقیق و عمیق مسئلہ ہے ہرگز نہ الجھیں، اور نہ بحث و مباحثہ کریں ورنہ ایمان کا خطرہ ہے۔[۲۱]

مولاناؒ نے اس کتاب میں تصوف اور صوفیاء کے متعلق اکابر شیخ کے اقوال اور خیالات نقل کئے ہیں بعد میں بطور محاکمہ اپنی رائے درج کرتے ہیں۔

"ان الفاظ کی تشریح و توضیح میں تفاوت بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ مقصد و مدعا سب حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کا ایک ہی ہے یعنی تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حال میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہنے کا، جب حضرات صوفیہ برحق رحمۃ اللہ علیہم کے نفوس مقدس و منور ہو جاتے ہیں، حجابات دور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اتباع کرنے لگتے ہیں تو ایسی حالت میں اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کا ان پر خاص

۲۱۔ ایضاً ص ۱۳۴ - ۱۳۵

کرم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے رسول) کہدیجئے کہ اگر خدا کو دوست رکھوگے تو میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت حقیقت میں محبت الٰہی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا صلہ ہی محبت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے فرمایا ہے

فاوفر الناس حظا من متابعة	(ترجمہ) پس جو شخص جتنا زائد متبع رسول
الرسول اوفرهم حظا من	صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی قدر زائد وہ محبت
محبة الله تعالیٰ والصوفية	الٰہی کا بھی حصہ دار ہے اور تمام اسلامی گروہوں
من بين طوائف الاسلام	میں صوفیہ ہی نے سب سے زیادہ اتباع رسول
ظفروا بحسن المتابعة[۱]	صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے۔ (عوارف المعارف ج ۲) [۱]

اس طرح حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب "فیوضات وزیریہ" میں اکابر مشائخ وصوفیاء کے طرز پر تصوف اور اسکے متعلقات کی وضاحت کی ہے اور اسی تصوف کو رائج قرار دیا ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اور شریعت کے تحت ہو، غیر شرعی امور کو تصوف سے خارج قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خانصاحب نے زیادہ تصانیف نہیں چھوڑی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنا وقت درس وتدریس اور وعظ ونصیحت میں زیادہ گزارا اگر حضرت مولانا تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً اس دور کے ایک بڑے مصنف ہوتے۔

مندرجہ بالا سطور سے مولانا کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ نے اس دور میں رامپور کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عامۃ المسلمین کی بالعموم جس طرح خدمت کی اور دینی امور میں رہنمائی کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

---

[۱] ایضاً ص ۱۵۰، ۱۵۱